جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

امام الہند
مولانا ابوالکلام آزادؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

”ایک مسلمان سے یہ توقع کرنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقینا ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور اداءِ فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے، اور 'دو اور دو' کو اس لیے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سچائی اور حقیقت ہمیشہ خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔[۱۴]“

(ابو الکلام آزاد)

ابوالکلام آزاد

پیدائش اور بچپن: محی الدین احمد (ابوالکلام آزاد) 11 نومبر 1888 کو مقدس شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ان کا گھرانہ علمی لیاقت کے لیے کافی مشہور تھا۔ان کے آباء مغل بادشاہوں کے دربار کے کئی اہم مناصب پر فائز رہے تھے۔ابوالکلام نے والدین کی نگرانی میں ہی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اردو، عربی و فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔دیگر اساتذہ سے تاریخ، فلسفہ، الجبرا، منطق، کیمیا اور اسلامیات جیسے مضامین کے لیے استفادہ کیا۔بچپن سے ہی ابوالکلام کو ڈسپلن کا پابند بنایا گیا تھا۔صبح جلد اٹھنا، رات کو جلد سونا، وقت پر کھانا وغیرہ۔ذرا بڑے ہونے پر انھیں عبادات سے اس درجے لگاؤ پیدا ہوا کہ والد صاحب کے ساتھ وہ بھی دو بجے تہجد کے لیے اٹھنے لگے؛ پھر تو یہ زندگی بھر کا معمول ہوگیا۔مختلف کھیل جو اس زمانے کے بچوں میں رائج تھے ان سے ابوالکلام متوحش اور نابلد تھے۔خود ان کی بہن کا بیان ہے کہ بچپن میں مولانا کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ناتواں کندھے اور چھوٹے سے جسم پر کسی بڑے فلسفی اور علامہ کا دماغ پیوست کر دیا گیا ہو۔

صحافت کا میدان: مولانا آزاد کو مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔اپنی تمام جیب خرچ سے وہ کتابیں خرید لیا کرتے تھے اور چراغ کی روشنی ہی میں دیر رات تک مطالعے میں مصروف رہا کرتے تھے۔اس وسیع مطالعے کی وجہ سے ان کے خیالات میں جدت کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی پیدا ہوئی۔ بارہ برس کی عمر ہی کے تھے کہ اشعار کہنے لگے۔اس کمسنی میں شاعری کا ایک مجلہ نیرنگ عالم آٹھ مہینے تک نکالا۔اگلے سال الصباح نکال کر چار مہینے تک چھاپتے رہے۔اس زمانے میں وہ خدنگِ نظر کی ادارت بھی کی۔ان کے عالمانہ مقالات مخزن، احسن الاخبار، مرقعِ عالم جیسے مایہ ناز رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ستمبر 1903 میں لسان الصدق جاری کیا جو مئی 1905 تک نکلتا رہا۔اس کے مضامین اس قدر مقبول ہوئے کہ اگلے سال اپریل 1904 میں جب آپ انجمن

حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے تو لوگوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی کہ یہ نوخیز نوجوان ہی ابوالکلام آزاد ہے۔ 1905 میں علامہ شبلی کی ایما پر الندوہ سے وابستہ ہوئے۔ وکیل اور دار السلطنت میں بھی کام کیا۔ 1912 میں ان کا جاری کردہ الھلال ہندوستان میں صحافت کے میدان میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ پہلا رسالہ تھا جس میں فوٹو کی اشاعت ہوئی اور جو ٹائپ تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی اشاعت گیارہ ہزار سے زیادہ ہوگئی۔ الھلال کے ذریعے ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی اخلاقی زبوں حالی پر سخت تنقید کی، ملک کی سیاست میں مسلمانوں کی قابلِ نظر انداز مداخلت پر قوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں سے 'جہاد' کرنے کی اپیل کی۔ ان کی کھری کھری صلواتیں برطانوی حکومت کے گلے سے نہیں اتریں۔ حکومت نے الھلال پر طرح طرح کی پابندیاں لگائیں لیکن مولانا نے خستہ حالی کے باوجود رسالے کو جاری رکھا، مجبور ہو کر حکومت نے رسالے کی آتش فشانی، مقبولیت اور اثرات سے خائف ہو کر نومبر 1914 میں رسالے پر قانونی پابندی لگائی لیکن ابوالکلام کے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ ایک سال کے اندر ہی اندر انھوں نے ایک دوسری پریس قائم کر کے الھلال ہی کی نہج پر البلاغ کا آغاز کیا۔ الغرض۔

یہ قینچیاں ہمیں اڑنے سے خاک روکیں گی
کہ ہم پروں سے نہیں حوصلوں سے اڑتے ہیں

گو البلاغ کی عمر صرف پانچ ماہ ہی رہی اور اس کے بعد مولانا آزاد سیاست میں سرگرم ہو گئے، لیکن صحافت سے ان کا ناتہ مکمل طور پر نہیں ٹوٹا۔ اقدام، پیغام، الجامعہ (عربی) اور الھلال کے دوسرے دور کے ساتھ وہ بار بار منظرِ عام پر آتے اور جھلک دکھلاتے رہے۔

سیاست: مولانا آزاد لکھتے ہیں، "**ھمارے عقیدے میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفرِ صریح ھے اور پالٹکس بھی اس میں داخل ھے۔**" اسی پاکیزہ سیاسی نظریے کے ساتھ مولانا آزاد سیاست کے دلدل میں کود پڑے اور سیاست کی آلودگیوں سے حتی الامکان اپنے دامن کو آزاد ہی رکھا۔ سب سے پہلے وہ سرسیدی نہج پر سیاسی سنیاس کے قائل تھے پھر 1908 کے انقلابی دور میں وہ بھی مسلح بغاوت کے حامی رہے، بعد میں وہ احیائے اسلام اور پین اسلامزم کی طرف مائل ہوئے۔ اس دور میں انھوں نے حزب اللہ نامی ایک دینی پارٹی

بھی تشکیل دی تھی۔ آخر کار اسلامی تشخص کی بقا کے ساتھ ساتھ متحدہ قومیت کے اصول پر ملک کی آزادی ان کا نصب العین بنا۔ ان کی خطرناک صحافتی سرگرمیوں کی پاداش میں انگریز حکومت نے مارچ 1916 میں انھیں رانچی میں نظر بند کر دیا جہاں سے مولانا دسمبر میں ہی باہر آ پائے۔ 18 جنوری 1920 کو گاندھی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ایک ہی ملاقات میں ان دونوں عظیم شخصیات میں اخوت کا ایسا رشتہ استوار ہوا جو عمر بھر قائم رہا۔ گاندھی، آزاد اور حکیم اجمل خان نے راؤلٹ ایکٹ کے سیاہ قانون اور برطانوی استعمار کے خلاف احتجاج کے لیے عدم تعاون اور ترک موالات کا منصوبہ بنایا اور پورے ملک میں تحریک شروع کر دی۔ گاندھی اور آزاد نے ملک بھر میں دورے کر کے لوگوں کو آزادی کے لیے قربانی دینے پر ابھارا۔ خلافت تحریک بھی ساتھ ساتھ جاری تھی جس میں مولانا آزاد کا تعاون کسی سے کم نہیں تھا۔ متعدد صوبائی اور کل ہند خلافت کانفرنسیں مولانا آزاد کی صدارت میں منعقد ہوئیں۔ یوں مولانا آزاد نے خلافت تحریک اور تحریک عدم تعاون کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کے دیرینہ مقصد کے حصول کی کوشش کی۔

فروری 1920 تک مولانا آزاد کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا جائے، انھیں بتایا جائے کہ بغیر امام ان کی زندگی غیر اسلامی اور ان کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ جب مسلمان ایک امام کو تسلیم کر کے امارتِ شرعیہ قائم کر لیں تو وہ امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے، اور یوں ہندوستانیوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست ہو۔ لیکن بڑے بڑے علماء امارت کے لیے مولانا آزاد کا ہی نام پیش کرنے لگے۔ مولانا آزاد کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا کہ کہیں یہ امامت کی تحریک جو امتِ مسلمۂ ہند کو متحد کرنے کے لیے برپا ہوئی ہے انھیں مزید ٹکڑوں میں نہ منقسم کر دے۔ انھوں نے انکساری کے ساتھ معذرت کر لی اور ملی اتحاد کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

1921 کا سال جدو جہد بھرا سال رہا، دسمبر میں مولانا آزاد گرفتار ہو گئے، مقدمہ چلا، مولانا کا جرأت مندانہ تحریری بیان قولِ فیصل خاصا مقبول ہوا۔ انگریز عدالت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مولانا نے کہا، ''مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۴۴ (الف) کی خلاف ورزی کے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔'' سال بھر قید کے بعد 6 جنوری 1923 کو وہ رہا ہوئے۔ تحریکِ آزادی

کے لیے یہ بڑا افراتفری کا دور تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کے نتیجے میں آزادی کا گاندھیانہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ بے چینی اور اضطراب عوام میں فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کر گیا، کانگریس خود دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ان مایوس کن حالات میں مولانا آزاد نے اپنے حواس قائم رکھے، کانگریس کو اختلافات کے باوجود ایک جھنڈے تلے متحد رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ انہی خدمات کے عوض انھیں کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی اتنی کم عمر میں کانگریس کا صدر بن سکا۔ مایوسی کے اس ماحول سے مولانا آزاد نے کانگریس کو تحریکِ آزادی کی قیادت کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ زمینی سطح پر کام پر توجہ دی۔ عوام سے رابطہ استوار کیا۔ 1927 میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ انہی کی صدارت میں ہوا، بائیکاٹ کی اس تحریک کو عوامی سطح پر لانے کے لیے انھوں نے شمالی ہند کا دورہ کیا۔ 1939 میں وہ ایک بار پھر کانگریس کے صدر بنائے گئے اور جنگِ عظیم دوم کے پرآشوب ماحول میں تحریکِ آزادی کی قیادت کی۔ سبھاش بوس کی انقلابیت، نہرو کی اشتراکیت اور گاندھی کے آئیڈیلزم کے درمیان وہ مولانا آزاد کی شخصیت ہی تھی جو اعتدال کی راہوں پر قائم اور اسی کی داعی تھی۔ مسلم لیگ کے معاملے میں بھی مولانا آزاد کا موقف کسی افراط وتفریط سے پاک تھا۔ نہرو کی طرح وہ اسے انا کا مسئلہ بنا کر جناح اور مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کی پالیسی کے خلاف تھے۔ وہ ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت کے قیام کے خواہاں تھے جس میں دفاع، خارجہ پالیسی اور کمیونیکیشن کے علاوہ سارے اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ مولانا آزاد کی یہ رائے مان لی جاتی تو تقسیم کے دردناک سانحے سے بچا جاسکتا تھا۔ کیبینیٹ مشن پلان پر کانگریس اور لیگ کا سمجھوتہ بھی ہو گیا تھا لیکن عین اسی وقت حالات سے مطمئن ہو کر مولانا آزاد نے کانگریس کی صدارت کے لیے کھڑے ہونے سے انکار کر دیا اور نہرو کا نام پیش کیا جو منتخب ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی بن گئی۔ نہرو کے ایک غیر ذمہ دارانہ اخباری بیان نے کانگریس اور لیگ کے اتحاد کو بھسم کر دیا۔ مولانا آزاد ایک طرف تو نہرو، پٹیل، گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن کے خلاف متحدہ ہندوستان کے لیے ایک ہاری ہوئی جنگ لڑتے رہے تو دوسری طرف انھوں نے پاکستان کے مہمل تصور کے خلاف مسلمانوں کو للکارا۔ مگر زمانے نے زمانے سے آگے سوچنے والے اس لیڈر کی ایک نہ سنی... تقسیم کا سانحہ پیش آ کر رہا۔

اپنی تعلیمی وثقافتی لیاقتوں کی بنا پر وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔ دیگر ماہرینِ تعلیم

کے ساتھ مل کر انھوں بچوں کے لیے مفت پرائمری تعلیم کا ایک ملک جاتی منصوبہ بنایا۔ اس کے علاوہ ناخواندگان میں تعلیمی مہمات کے ذریعے پڑھنے لکھنے کا رجحان پیدا کرنے کی سعی کی۔ وہ مادری زبان کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنانے کی وکالت کرتے تھے۔ انہی کی ایما پر پنج سالہ منصوبوں میں تعلیم کو اہم مقام عطا کیا گیا۔ اپنی وفات تک یعنی پورے گیارہ سال انھوں نے وزارتِ تعلیم کا قلمدان سنبھالا۔

تصانیف: باوجود اس کے کہ مولانا آزاد کی زندگی ایک سرگرم سیاستداں کی زندگی تھی، جس کی زندگی کے نو سال آٹھ مہینے یعنی ہر ساتواں دن جیل میں گزرا مولانا آزاد نے قابلِ قدر تصنیفی ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں ترجمان القرآن (چار جلدیں)، غبارِ خاطر، تذکرۃ، الحریت فی الاسلام، جہاد اور اسلام، اسلام اور نیشنلزم، قرآن کا قانونِ عروج و زوال، انڈیا ونس فریڈم وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے مقالات اور خطبات کے سیکڑوں مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 22 فروری 1958 کو اس علم و فضل کے بحرِ بیکراں، دور اندیش سیاستداں، مدبر، پالیسی ساز، قائد اور صحیح معنوں میں امام الہند نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔

آمین!